بشیر پاشا سیریز

تذکرہ

مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم

مرتبہ

سید عبدالکریم بی۔ اے۔ ایل ایل بی

سوانح عمری سکول اٹاوہ

Title and inside Blocks printed by Taj Printing \
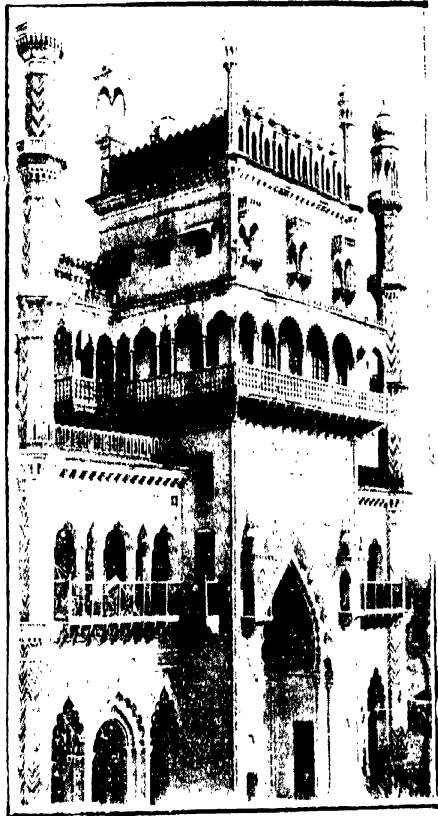
تذکرۃ المشاہیر

نوجوانانِ قوم میں ملک اور قوم کی خدمتوں کا جذبہ پیدا کرنے اور اُن کے حوصلے بڑہانے کیلئے ان مشاہیر قوم کی سوانح عمریوں کا مطالعہ جنہوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی ترقیوں میں جانفشانیاں کی ہیں نہایت موثر ذریعہ ہے اور ہر ملک و ہر قوم میں اس ذریعہ سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے اعظم الرجال کی بڑی بڑی سوانح عمریوں کے علاوہ خوشنما سائز اور عمدہ طباعت کے ساتھ کم قیمت لایف اسکیچ بہ کثرت شائع کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہندستان میں مسلمانوں نے اس ذریعہ پر کچھہ توجہ نہیں کی حالانکہ دوسری قومیں اسی ذریعہ سے بہت کچھہ منافع حاصل کر رہی ہیں اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر میں نے اور مولوی بشیر الدین صاحب منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نے ارادہ کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس عصر جدید میں جن مشاہیر نے اپنی عمریں قومی خدمت اور قومی ہمدردی میں صرف کی ہیں ان کے لائف اسکیچ شائع کئے جائیں۔ چنانچہ اسوقت اس سلسلہ کے چند نمبر شائع کئے جاتے ہیں اور میں اُن عزیزوں اور دوستوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ہماری اس خواہش کی تکمیل میں اپنا وقت صرف کر کے اور محنت اُٹھا کر ان تذکروں کو مرتب کیا ہے خداوند تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ہم کو اپنے ارادہ میں کامیاب کرے۔

میں اپنے پرجوش نوجوان دوست سید عابد جلیل صاحب کا جو بمبئی میں فن طباعت کی تکمیل کر رہے ہیں خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے نہایت تنگ وقت میں تصاویر کے ایسے اچھے اور عمدہ بلاک خود تیار کر کے بطور امداد عنایت کئے اور اپنی نگرانی میں اُن کو طبع کرایا۔

میں اپنے اہل قلم نوجوانانِ قوم سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس قومی خدمت میں ہماری مدد کر کے عنداللہ ماجور ہوں۔ اس سلسلہ کی اشاعت سے اگر کچھہ فائدہ ہوا تو اسی سلسلہ کی توسیع میں صرف ہوگا

محمد الطاف حسین بی اے
ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول

معنون

میں اس سلسلہ کو اپنے شاگرد رشید جواں مرگ **بشیر پاشا** مرحوم بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ کے نام معنون کرتا ہوں جس کی زندگی اور جس کی تعلیم و تربیت کا مقصد قوم کی تعلیمی خدمت تھی اور جس نے تکمیل تعلیم کر کے اپنی زندگی کو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔

محمد الطاف حسین

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ

گذارش

جس وقت میرے برادرِ معظم مولوی محمد امین صاحب زبیری نے
مجھ سے اس تذکرہ کی ترتیب کے لئے غیر معمولی طور پر تاکید کے ساتھ فرمائش
کی تو مجھے یک گونہ تعجب ہوا کیونکہ نہ میں نے قومی لٹریچر میں صاحب تذکرہ
کے متعلق کچھ پڑھا تھا اور نہ ایم، اے، او کالج کی سات سالہ زندگی میں
کبھی اُن کی نسبت کچھ سنا تھا۔ البتہ کالج کے لکچر روم سے گذرتے
ہوئے ایک کتبہ کے روشن الفاظ پر ضرور نظر پڑتی تھی لیکن اُس
زمانہ میں وہ روشن بھی نہ معلوم ہوتے تھے مگر جب اُس تذکرہ کا مواد
ملا اور میں نے اُس کو پڑھنا شروع کیا تو جس قدر میں پڑھتا تھا اُسی قدر
مجھے خوشی ہوتی تھی کہ ایک نادر موقع اس عظیم المرتبت محسن کے احسانات
کی شکر گزاری کا حاصل ہو رہا ہے جس کی سعی وہمت اور ہمدردی و
دلسوزی کے آثار تو عظمت وشان کے ساتھ قائم ہیں لیکن اُس کا ذکر فراموش
کر دیا گیا ہے اور اُس کے احسانات بھلا دیئے گئے ہیں۔ میں نے
اسی جوش میں اس تذکرہ کو ختم کیا ہے اور چونکہ صفحات محدود کر دیئے

تھے اس لئے مجھے بھی واقعات کو مختصر اور جوش کو محدود کرنا ناگزیر تھا۔
میں اس رسالہ کو بشیر پاشا سیریز میں شامل کئے جانے کے
لئے مولوی بشیر الدین صاحب منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کی خدمت
میں پیش کرتا ہوں جو اُن کی ذات بابرکات کے ساتھ ایک عقیدت
اور اپنے کالج و بورڈنگ فیلو بشیر پاشا مرحوم کی حوصلہ مندی و ایثار
کی عزت کے اظہار کا ایک وسیلہ و ذریعہ ہے۔

سید عبدالکریم۔ بی۔ اے (علیگ۔)

ایل۔ ایل۔ بی سب جج

بھوپال

(کتبہ جمیل الدین بھوپالی)

حاجی مولوی محمد سمیع اللہ خان بہادر

سی۔ ایم۔ جی

(۱)

مولوی محمد سمیع اللہ خاں کی ولادت ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء کو بمقام دہلی ہوئی۔ ان کے والد مولوی محمد عزیز اللہ خاں تھے جن کا سلسلہ نسب ۳۲ ویں پشت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے، یہ عربی خاندان ابتدا ًہندوستان آکر ڈیرہ غازی خاں میں آباد ہوا تھا لیکن مولوی صاحب کے جد امجد شیخ احمد صاحب علوی نے شاہ عالم شہنشاہ دہلی کے اصرار سے دہلی میں اقامت اختیار کر لی تھی اور شہنشاہ نے میرٹھ اور رہتک کے اضلاع میں ان کو جاگیر عطا کی تھی۔

حاجی صاحب نہایت زبردست عالم اور مشہور مفسر و محدث تھے اور مدرسہ ارادتمنداں اور دوسری شاہی تعلیم گاہوں میں درس دیتے تھے اور ان کے حلقہ درس میں بہ کثرت طالبانِ علم شریک ہوتے تھے ان کا وعظ نہایت موثر ہوتا تھا اور یہ بات مشہور ہے کہ ان کے وعظ

کے اثر سے لوگ اسلام قبول کرتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی علوم مذہب کا مرکز بنا ہوا تھا، شاہ ولی اللہ شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر (رحمتہ اللہ علیہم اجمعین) اسی زمانہ میں تھے۔

حاجی صاحب اور ان کی اولاد کے تعلقات دہلی کے اکثر اعلیٰ گھرانوں سے ہو گئے، انگریزی حکومت شروع ہونے پر بھی اس خاندان کے ارکان نے اپنی قابلیتوں کی وجہ سے عدالتی اور سیاسی عہدے حاصل کئے چنانچہ مولوی محمد سمیع اللہ خاں کے والد ۱۸۳۸ء میں جنرل آکٹرلونی کے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ میں قابل اعتماد افسر اور کچھ عرصہ تک دربار ناہن کے پولیٹکل ایجنٹ رہے۔ ان کے دو چچا رواڑی اور دہلی میں صدر امین اور مفتی کے عہدوں پر مامور تھے۔ اور ان کے ماموں نے اس زمانہ میں بحیثیت ایک وکیل کے خاص شہرت و عزت حاصل کی تھی

مولوی صاحب نے مشہور علمار سے اپنی تعلیم کی تکمیل کی، دہلی کے مشہور علمار مفتی صدرالدین خاں اور مولوی مملوک علی اور سید محمد سے قانون فلسفہ اور فقہہ کی تعلیم حاصل کی اور پھر ملا محمود جان کے حلقہ درس میں رہنے کے بعد ان کے سر پر دستار فضیلت باندھی گئی۔ مگر انھوں نے کسی اور مشغلہ میں مصروف ہونے کے بجائے

اپنے اساتذہ کی خواہش پر طلبا کو جن میں افغانستان اور وسط ایشیا کے طالب علم اُن سے دوگنی عمر کے بھی تھے قانون و فلسفہ کا درس دینا شروع کیا لیکن اب زمانہ بدل رہا تھا اور حکومت اپنی ملازمت میں صرف قابل اشخاص ہی کو نہیں بلکہ اُن لوگوں کو ترجیح دینے لگی جو مقررہ امتحانات میں کامیابی حاصل کریں۔

مولوی سمیع اللہ خاں بھی ۱۸۵۶ء میں منصفی اور وکالت کی امتحانات میں جو دہلی میں منعقد ہوے تھے شریک ہوئے اور انہوں نے اول درجہ میں کامیابی حاصل کی۔

جب مفتی صدرالدین خاں کو ان کی کامیابی کا حال معلوم ہوا تو اپنے نوجوان شاگرد کو بلا کر مبارکباد دی لیکن ان کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے نم ہوگئیں اور انہوں نے کہا کہ "مجھے اپنے شاگرد کی کامیابی پر تو مسرت ہوئی ہے مگر افسوس یہ ہے کہ شمع تعلیم کو وہ روشن نہ رکھ سکے گا۔ اور جس مقصد سے کہ اساتذہ نے اس کو تعلیم دی ہے وہ پورا نہ ہوگا اور وہ ان کے نام کو زندہ نہ رکھے گا۔"

دو سال بعد وہ کانپور میں منصف مقرر ہوئے اور اس عہدہ کے فرائض ایسی قابلیت سے انجام دئے کہ ان کے افسروں نے نہایت اعلیٰ درجہ کے الفاظ میں ان کی قابلیت کا اعتراف کیا۔

مسٹر شیر مجسٹریٹ کانپور نے ۱۹ فروری سنہ ۱۸۶۰ء میں ان کی نسبت لکھا کہ :-

"میں نے ان میں ہمیشہ اعلیٰ ذہانت پائی اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اپنے عہدہ کے اعتبار سے ہمیشہ ان کی عزت کی گئی"

مسٹر فین جج نے اس طور پر اعتراف کیا کہ :-

"منصفانہ اور بعجلت صادر ہونے والے فیصلہ جات کی وجہ سے حکام بالا اور اہل مقدمہ دونوں یکساں مطمئن تھے"

مسٹر پیرسن ڈسٹرکٹ جج (بعد میں آنریبل جج ہائی کورٹ) نے سرکاری رپورٹ میں ان کے متعلق لکھا کہ :-

"میرے خیال میں وہ اعلیٰ ترین قابلیت کے ہونہار حاکم ہیں"

اسی طرح مسٹر بینن نے جو ہائی کورٹ کے بہترین جج رہے ہیں ان کو ایک ذہین منصف" اور "بہترین جج" کہا۔

پانچ سال کی سرکاری ملازمت کے بعد وہ مستعفی ہو گئے اور سنہ ۱۸۶۲ء میں انہوں نے آگرہ[۱] کی صدر عدالت دیوانی اور الٰہ آباد میں وکالت شروع کی جس میں ان کو بحیثیت ایک متقن اور ہوشیار قانون پیشہ

---

[۱] - پہلے صوبہ ممالک متحدہ کا صدر مقام آگرہ تھا۔

کے بہت فروغ ہوا۔ ان کی وجاہت خوش بیانی اور محنت حکام کی توجہ اور اہل مقدمہ کی طمانیت کی کفیل تھی۔ ان کو اس پیشہ میں سر والٹر مورگن، سر چارلس ٹرنر، مسٹر راس، مسٹر اسپنکی، اور مسٹر پیرسن جیسے ممبران دربار اور دیگر انگریز مقننین کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑا اور سب نے ان کی قانونی قابلیت کی داد دی۔ اگرچہ ان کی خاصی شہرت اور معقول آمدنی تھی لیکن قدیم دوست اور مربی آنریبل مسٹر جسٹس پیرسن کے مشورہ سے ۱۱ سال بعد ۱۸۷۳ء میں پھر ان کا خیال ملازمت کی طرف رجوع ہوا۔ اور فوراً ہی جج ماتحت کے عہدہ پر مامور ہو گئے۔ یہ پہلے وکیل تھے جو اس اہم عہدہ پر مقرر کیے گئے۔

ان کے تقرر کے وقت ہائی کورٹ کے ججوں نے خاص طور پر تعریف کی تھی۔ اور ایک موقع پر ہائی کورٹ نے لوکل گورنمنٹ کی مراسلت میں لکھا تھا کہ:۔

"عدالت کی رائے میں مولوی سمیع اللہ خاں صوبہ شمالی[1] و مغربی میں نہایت قابل اور جوڈیشل حکام میں فرد فرید ہیں۔"

گورنمنٹ نے ان کو مختلف موقعوں پر ممالک مغربی و شمالی کے

---

[1] صوبہ ممالک متحدہ کا نام صوبہ شمال و مغرب تھا۔

مختلف اضلاع میں کام کی اصلاح کے واسطے خاص طور پر متعین کیا اور انھوں نے امید کے مطابق ان خدمات کو انجام دیا۔ چونکہ وہ انگریزی سے ناواقف تھے اس لیئے ہائی کورٹ کے جج نہ ہو سکے جس پر خود گورنمنٹ نے اپنا افسوس ظاہر کیا۔

پنڈت اجودھیا ناتھ نے جو الہ آباد کے ممتاز وکیل تھے ان کی قانونی قابلیت اور فیصلوں کی مضبوطی کی نسبت یوں اعتراف کیا ہے کہ۔

"جس ضلع میں بھی وہ مقرر ہوئے اپیل ثانی کی نوبت نہ آئی اور اپیل اول میں بھی اس فریق کو جس کے موافق فیصلہ ابتدائی ہوتا تھا مختصر روئداد فائدہ پہنچانے کے لئے کافی ہوتی تھی"۔

سنہ ۱۸۸۰ء میں انھوں نے یورپ کا سفر کیا اور انگلستان کی سیر کی۔ ہز رائل ہائنس پرنس آف ویلس نے (درباریوں) شرف حضوری عطا کیا۔ اور سکریٹری آف اسٹیٹ اور دیگر حکام سلطنت اور ممتاز اصحاب سے ملاقاتیں ہوئیں۔

سنہ ۱۸۸۳ء میں جبکہ ارل آف نارتھ بروک مصر کے لارڈ ہائی کمشنر مقرر ہوئے اور ایک ہندوستانی کو اپنے اسٹاف میں رکھنا چاہا تو حکومت ہند نے مولوی صاحب کی بوجہ ان کی قابلیت اور اہلیت کے سفارش کی۔ چند سال قبل لارڈ ڈفرن نے مصر میں عدالتیں

قائم کی تھیں اور اس کام کی تکمیل مولوی صاحب کے سپرد کی گئی۔ وہ ۲ ستمبر ۱۸۸۵ء کو مصر روانہ ہوئے اور وہاں پہونچکر نہایت عمدگی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیں۔

بہت سے مذہبی اور سیاسی شبہات جو مصریوں کے دلوں میں انگریز قانون دانوں اور جدید عدالتوں کے متعلق تھے یہ دیکھ کر دور ہو گئے کہ مولوی صاحب جیسے علما جو خود مصری اقوام میں مفتی یا قاضی بننے کے اہل تھے ہندوستانی عدالتوں میں حاکم ہیں۔ مولوی صاحب نے بہت سے قصے مصریوں کے شکوک شبہات کے بیان کئے ہیں جو وہ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کے برتاؤ کرنے کے متعلق رکھتے تھے۔ علما ازہر و قاہرہ اور صوبہ جات کے شیخ ان سے بہت خوش تھے اور چونکہ یہ کتابی عربی بولتے تھے ان کو وہ لوگ "صرفی ونحوی" کہتے تھے۔ مولوی صاحب سے ایک دو ملاقاتوں کے بعد ان کے بیشتر شکوک رفع ہو جاتے تھے۔

انھوں نے ان انتظام و حالات وغیرہ کے متعلق ایک مبسوط رپورٹ بھی تیار کی تھی جو گورنمنٹ میں پیش ہوئی اور ان مصری معاملات میں جن کا تعلق ان سے تھا ایک اہم دستاویز منصور کی گئی۔ آرل آف نارتھ برُک نے مولوی صاحب کو پہلے بھی دیکھا تھا۔

لیکن مصر کے قیام میں ان کے عمدہ کام سے واقفیت حاصل کی اور نہایت عنایت سے پیش آئے انھوں نے لکھا ہے کہ :-

"سمیع اللہ خاں نے ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر مصریوں کے اطوار سے واقفیت حاصل کی اور ان کی رائے اس مسئلہ میں قابل قدر ہے۔"

وزیر خارجہ لارڈ گرینوائل نے بھی (۱۰ نومبر ۱۸۸۳ء کے مراسلہ میں) ان کی رپورٹ کو "دلچسپ اور قیمتی" کہا ہے۔

۱۸۸۴ء میں محمڈن کالج کے ایڈریس کے جواب میں ہز اکسلنسی لارڈ رپن وائسرائے و گورنر جنرل ہند نے جو تقریر کی اس میں بھی ان خدمات کا اس طرح تذکرہ کیا۔

"اے صاحبو! آپ اس بات سے واقف ہیں کہ جس وقت لارڈ نارتھ بروک حال میں مصر کو بھیجے گئے تھے تو صاحب ممدوح نے یہ استدعا کی تھی کہ اس ملک سے کوئی شریف مسلمان ان کے اشاف میں مدد کے واسطے بھیجا جاوے۔ چنانچہ مولوی صاحب ممدوح اس مقصد کے واسطے منتخب کئے گئے اور مجھ کو بخوبی یقین ہے کہ جو فرائض انہیں تفویض کئے گئے تھے ان کو انہوں نے لیاقت کے ساتھ پورا کیا۔

۱۸۸۳ء کی تقریب نوروز پر ان مصری خدمات کے صلہ میں ملکہ معظمہ

قیصرِ ہند کے حضور سے ان کو سی۔ایم۔جی۔ کے خطاب سے ممتاز کئے جانے کا اعلان ہوا۔اور اپریل ۱۸۸۵ء میں بمقام لکھنو ہز آنر لفٹنٹ گورنر نے ایک جلسہ میں جس میں کہ اعلیٰ عہدہ دار تعلقدار اور بار کے معزز ممبر شریک تھے خطاب کا تمغہ عطا کیا۔شب کو بارہ دری قیصر باغ میں اودھ کمیشن کے ہندوستانی عہدہ داروں وکیلوں ہندو اور مسلمان رئیسوں نے ایک بہت بڑا ڈنر دیا بہت دل چسپ تقریریں ہوئیں اور ختم دعوت کے بعد آتشبازی چھوڑی گئی۔

اسی مہینہ میں سر الفرڈ لائل نے انکو اودھ کا ڈسٹرکٹ اور سشن جج بھی مقرر کیا اس زمانہ میں اس عہدہ پر صرف یہی ایک ہندوستانی تھے جو انگریزی سے ناواقف تھے لیکن انھوں نے تین اضلاع کے سشن جج کی حیثیت سے انگریز حکام کے دوش بدوش اس اعلیٰ عہدہ کے فرائض انجام دئے۔اور ہر ضلع میں نہایت ہر دل عزیز رہے۔

جب وہ کسی ضلع سے تبدیل ہوتے تو بار اور پبلک دونوں کو صدمہ اور نقصان عظیم محسوس ہوتا اور رخصت کے وقت جو الوداعی دعوتیں اور تقریریں ہوتیں وہ دراصل ان کی اس ضلع کی عدالتی زندگانی کا تبصرہ ہوتیں جس سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ پبلک میں اپنے منصفانہ فیصلوں اور اپنے اعلیٰ اخلاق کے سبب سے کیسے ہر دلعزیز بنتے دہ بنچ اور بار کے تعلقات

کو خوب سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ بار میں باوجودیکہ وہ مختلف المذاہب ممبروں سے مرکب ہوتا تھا لیکن ان کا احترام سب کے دلوں میں یکساں تھا۔

وہ شمال و مغرب کے متعدد ضلاع میں رہے اور ہر جگہ مختلف خیالات کے آدمیوں سے سابقہ ہوا لیکن ان کی نسبت عظمت و محبت میں سب متحد الخیال ہی رہے۔

۲۰ سال کے بعد ۱۹۰۲ء میں انھوں نے ملازمت سے کنارہ کشی کی لارڈ رپن نے اس موقع پر ان کو لکھا کہ "میں نہیں جانتا تھا کہ آپ ملازمت سے اتنی جلد علیحدہ ہو جائیں گے لیکن کئی سال عزت کے ساتھ ملازم رہ کر آپ نے یہ استحقاق حاصل کرلیا ہے کہ صبر و سکون کی زندگی بسر کریں۔

اخبارات نے اس کو صوبہ ممالک مغربی و شمالی کے جوڈیشل ڈپارٹمنٹ کا ایک نقصان عظیم متصور کیا۔ اب اگرچہ وہ سرکاری زندگی سے کنارہ کش ہو گئے تھے لیکن ان کی قانونی قابلیت کا جو اثر قانونی حکام کے دلوں میں قائم تھا اس کی بنا پر وہ ۱۹۰۳ء میں سر ڈینزل ابٹسن کی صدارت میں جو کمیشن کنٹونمنٹ ایکٹ پر غور کرنے کے لئے قائم ہوا تھا اس میں ممبر بنائے گئے اور انھوں نے اس ایکٹ پر ایک نہایت قابلانہ نوٹ تحریر کیا جس کو بہت سراہا گیا۔

(۲)

مولوی سمیع اللہ خاں نے سلطنت مغلیہ کے آفتاب اقبال کو ڈوبتے ہوئے دیکھا تھا اور ان مصائب کو جو ۱۸۵۷ء میں خاص دار السلطنت میں پیش آئے تھے برائے العین مشاہدہ کیا تھا نامی نامی اور بڑے بڑے خاندانوں کی تباہی کا دردناک نظارہ بھی کر چکے تھے۔ سلطنت انگریزی کے نشو و نما اس کی ترقی اور اس کے استحکام کے دور بھی ان کی آنکھوں کے سامنے تھے اور چونکہ وہ دور رس طبیعت رکھتے تھے اور ان باخبر اور دور اندیش علما میں تھے جو مقتضیات زمانہ کو خوب جانتے ہیں اس لئے ان کو یقین تھا کہ بغیر جدید تعلیم کے مسلمان نہ تو اپنا وقار قائم رکھ سکتے ہیں اور نہ نئی سلطنت میں ان کو کوئی حصہ مل سکتا ہے۔

ان کا خاندان علم و فضل اور اعزاز دنیوی کے لحاظ سے اگرچہ کافی مشہور و ممتاز تھا اور ان کے باپ اور چچا اعلیٰ مناصب حکومت پر مامور رہ چکے تھے لیکن وہ خود دیکھ رہے تھے کہ اب حکومت کے مد نظر اس قابلیت کا معیار جو ان مناصب و اعزازات کا ذریعہ ہوسکتی ہے بہت بلند ہوگیا تھا اس لئے وہ اپنی قوم میں علوم جدیدہ کی اشاعت کے سرگرم حامی تھے۔

سرسید کے ساتھ ان کی مذہبی رشتہ داری تھی اور جو کچھ وہ

اپنی قوم کی بھلائی بہبودی اور ترقی کی کوشش کرتے تھے اور جو منصوبے اور ارادے رکھتے تھے مولوی سمیع اللہ خاں ان سے اچھی طرح واقف اور ان کے حامی و موید تھے۔

۱۸۶۴ء میں جب سر سید نے سیٹیفک سوسائٹی قائم کی ہے تو مولوی سمیع اللہ خاں اس سرگرم حامیوں اور کارکنوں میں تھے اور سر سید کی عدم موجودگی میں وہی ان کے قائم مقام ہوتے تھے سر سید نے انگلستان سے واپسی کے بعد جب کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان[1] قائم کی تو مولوی سمیع اللہ خاں بھی اس کے ممبر تھے اور ان مساعی میں برابر حصہ لیتے تھے جو اس کمیٹی کا نصب العین تھیں۔ اور جب ان مساعی کے نتیجہ کے طور پر ایک مدرسہ قائم کرنا قرار پایا اور اس کے سرمایہ کی فراہمی کے لئے ۱۸۷۲ء میں بمقام بنارس مجلس خزینۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ العلوم للمسلمین (محمڈن اینگلو

---

[1] ۱۸۷۰ء میں قائم ہوئی جس نے اس امر کے متعلق کہ جہاں تک ممکن ہو اس بات کے وجوہ و اسباب کما ینبغی دریافت کئے جائیں کہ سرکاری کالجوں اسکولوں اور تحصیلی و حلقہ بندی مکتبوں میں مسلمان طلبا کیوں نہایت کم پڑھتے ہیں اور نیز عموماً مسلمانوں میں تحصیل علوم قدیمہ کیوں گھٹ گئی ہے اور علوم جدیدہ نے کیوں رواج نہیں پایا۔

اینڈیل کالج فنڈ کمیٹی) وجود میں آئی تو مولوی سمیع اللہ خاں سے اس امر کا فیصلہ ہونے کے بعد کہ یہ مدرسہ علیگڈھ میں بنایا جائے" نہایت سرگرمی سے کام کیا لیکن فراہمی سرمایہ میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ تہذیب الاخلاق کے مضامین کی وجہ سے طبقہ علماء میں جو علیگڈھ اور اس کے قرب و جوار میں بہت با اثر تھا سرسید سے شدید مخالفت رونما تھی اور ان جواب ہائے مضمون نے جن میں اس طبقہ پر بھی تعریضات تھیں اس مخالفت کو اور بھی شدید کر دیا تھا۔

سرسید موقع پر موجود نہ تھے بلکہ بنارس میں عدالت خفیفہ کی ججی پر مامور تھے لیکن حسن اتفاق سے مئی ۱۸۷۳ء میں مولوی سمیع اللہ خاں کا تبادلہ علیگڈھ ہو گیا اور انھوں نے کالج کے قیام پر اپنی توجہات اور مساعی کو انہماک کے ساتھ مبذول کر دیا سرسید نے کالج قائم کرنے کے لئے ۱۵ لاکھ روپیہ کا سرمایہ قرار دیا تھا جس کی فراہمی حالات کے لحاظ سے خارج از امکان نظر آتی تھی۔ مگر مولوی سمیع اللہ خاں نے اس موقع پر سرسید سے اختلاف کیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ مدرسہ قائم کرنے کے لئے اس رقم کا انتظار نہیں کرنا چاہیے اور جس قدر رقم فراہم ہو جائے اُس سے مدرسہ قائم کر کے ملک کے سامنے ایک نمونہ پیش کر دیا جائے اور جب لوگ اپنی آنکھوں سے اس مدرسہ اور اس کی تعلیم کو دیکھیں گے تو اس کی امداد کی طرف بھی متوجہ ہوں گے۔

اس مسئلہ میں بہت اختلاف رہا اور سرسید کسی طرح متفق نہ ہوئے مگر مولوی سمیع اللہ خاں نے ہمت و استقلال سے کام لیا اپنی کوٹھی پر سب کمیٹی کا جلسہ کیا جس میں رؤسا علیگڈھ اور بلند شہر بھی موجود تھے جن کے ساتھ ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے ۔

اس جلسہ میں ان سب نے معقول رقمیں دیں اور کئی ہزار روپیہ فراہم ہوگیا اب مولوی سمیع اللہ خاں نے فوراً مدرسہ جاری کرنے پر اصرار کیا اور بالآخر صدر کمیٹی بنارس نے باقاعدہ منظوری دیدی اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اخراجات تعلیم کا ایک تخمینہ بناکر ارسال کریں چنانچہ انہوں نے اس عظیم الشان انسٹی ٹیوشن کا جو آج مسلم یونیورسٹی کے نام سے تمام دنیا میں معروف ہے بجٹ تیار کیا جس میں معماہوار [illegible] روپیہ ماہانہ مشاہرات اور ماہوار [illegible] روپیہ وظائف تعلیم کا جملہ [illegible] روپیہ تھا کمیٹی نے اس بجٹ کو منظور کیا اور ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء بروز سالگرہ ملکہ معظمہ تاریخ افتتاح مدرسہ قرار پائی اور اس کے اشتہارات و اعلانات شائع کیے گئے تاریخ معینہ پر سرسید اور بعض دیگر ممبر بھی اس تقریب کے لئے علی گڈھ آئے اور افتتاح مدرسہ کی رسم ادا کی گئی ۔

اس وقت عمارات میں تین بنگلے تھے ایک میں اسکول تھا دوسرے میں بورڈنگ ہاؤس اور تیسرا پرنسپل کی سکونت کے لئے تھا۔

اسٹاف کا تقرر ہوا اور یکم جون ۱۸۷۵ء کو درجہ بندی ہو کر تعلیم شروع کی گئی۔ اس کی سب سے اول جو جماعت تھی اس کی پڑھائی سرکاری اسکولوں کی تیسری جماعت کے مساوی تھی۔

اس مدرسے کے رجسٹر طلبا میں سب سے پہلے **حمیداللہ خاں** (نواب سربلند جنگ حاجی محمد حمیداللہ خاں بی۔اے بار ایٹ لا) کا نام درج ہوا جو مولوی سمیع اللہ خاں کے بڑے صاحبزادے ہیں۔

مولوی سمیع اللہ خاں کی دلچسپی محنت اور انتظام سے اول ہی ششماہی میں مدرسے نے حیرت انگیز شہرت اور ترقی حاصل کر لی دور دراز سے طلبا آ کر داخل ہوئے جن میں رئیسوں اور خاندانی شرفا کے ہی نہیں بلکہ بعض علما کے لڑکے بھی تھے والیان ملک رؤسا اور گورنمنٹ سے

---

[1] منیجنگ اسٹاف میں مسٹر سڈنس پرنسپل (جن کے نام سے کالج کا مشہور یونین کلب قائم ہے) مولوی محمد اکبر صاحب ہیڈ پنڈت بیج ناتھ بی۔اے۔ سکنڈ ماسٹر مولوی ابوالحسن صاحب تھرڈ ماسٹر مولوی سید جعفر علی شیعہ عالم مولوی نجف علی صاحب مدرس اول فارسی تھے ان میں اس وقت تک مولوی ابوالحسن صاحب بدایونی زندہ ہیں اور کالج کے سابقون الاولون میں انہیں کی ایک ذات باقی ہے جس نے اس حقیر تخم کو ایسے تناور اور بارآور درخت کی صورت میں دیکھا ہے۔

گرانقدر مالی امدادیں بھی حاصل ہوئیں چنانچہ سید مرحوم نے بحیثیت سکریٹری خزینۃ البضاعۃ آنرایبل سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر کے سامنے ۱۱- نومبر ۱۸۷۵ء کو جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں ان امور کو تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے۔

اور اسی رپورٹ میں مولوی سمیع اللہ خاں کی مساعی جمیلہ کا ان الفاظ میں شکریہ ادا کیا ہے۔

اب مجھ کو کمیٹی کی جانب سے شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سکریٹری کمیٹی منتظم مدرسہ کا ان کی بے انتہا توجہ اور نہایت کوشش اور لیاقت سے درحقیقت کمیٹی اس مدرسہ کے جاری کرنے پر قادر ہوئی ہے اگر وہ مدرسہ کا انتظام اور تمام امور متعلق تعلیم و بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی اپنے ذمہ نہ لیتے تو ممکن نہ تھا کہ کمیٹی اس قدر جلد مدرسہ جاری کرسکتی۔"

آنریبل سر ولیم میور نے بھی اپنی جوابی تقریر میں مولوی صاحب ممدوح کے متعلق اعتراف کیا کہ :-

"مولوی سمیع اللہ خاں کی توجہ بغیر اس مدرسہ کی اس قدر بہبودی نہ ہوتی جو کچھ دیکھا جاتا ہے ان کے سبب سے ہے۔"

دسمبر ۱۸۷۵ء میں ہز ہائی نس مہاراجہ مہندر سنگھ بہادر۔ جی۔ سی۔

ایس - آئی - والی پٹیالہ علی گڈھ تشریف لائے مولوی سمیع اللہ خاں نے
ان کی مہمان داری کی سائنٹفک سوسائٹی اور مدرستہ العلوم کی طرف سے
ایڈریس پیش کیا اور ہز ہائی نس نے ۱۰۰۰ روپیہ سالانہ گرانٹ مقرر فرمائی۔
۱۸۷۶ء میں سرسید بھی پنشن لے کر علی گڈھ آ گئے اور اب ان کو
پورا وقت اپنے منصوبوں اور تدابیر پورا کرنے کے لئے ملا۔ مولوی سمیع اللہ
خاں ان کے قوت بازو تھے مختلف کمیٹیوں کا کام ان کے سپرد تھا کمیٹی منتظم
مدرستہ العلوم کی لائف آنریری سیکریٹری کمیٹی مدبران تعلیم اہل سنت
والجماعتہ کے پریسیڈنٹ اور کمیٹی مدبران تعلیم السنہ مختلفہ و علوم دنیویہ
کے وائس پریسیڈنٹ تھے اور وہ ہر کمیٹی کا کام نہایت جانفشانی اور
محنت سے کرتے تھے تعمیر کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا اور اس سلسلہ
کی پہلی عمارت جو تیار ہوئی اس کی پہلی اینٹ سرسید کے اصرار سے
مولوی سمیع اللہ خاں نے رکھی ۱۸۷۷ء کی رپورٹ میں جو سرسید نے
سالانہ جلسہ میں پڑھی تھی کہا تھا کہ :-

"یہ کالج جس کی میں نے اتنی بڑی رپورٹ آپ کے سامنے پڑھی
صرف مولوی سمیع اللہ خاں بہادر کے مستحکم ارادے اور صرف
ان کی رائے صائب کی وجہ سے قائم ہوا ہے کالج فنڈ کمیٹی
جس نے اس کالج کے قائم کرنے کا خیال کیا تھا اور جس کے

ایک ممبر مولوی محمد سمیع اللہ خاں بھی تھے۔ اس خیال میں تھے کہ
جب تک پورا پورا روپیہ جس کا اس نے تخمینہ کیا تھا اور جس کی تعداد
ڈیڑھ لاکھ تھی جمع نہ ہو جائے اس وقت تک کسی کالج یا اسکول کو
جاری کرنا نہیں چاہیئے صرف تنہا مولوی محمد سمیع اللہ خاں ہی
تھے جو اس رائے سے مختلف تھے اور جب ان کی رائے کی
شنوائی نہ ہوئی تو انہوں نے خود اپنی عالی ہمتی سے ایک خاص
چندے سے جس میں انہوں نے بڑی فیاضی سے علاوہ اپنے
پہلے چندے کے ہزار روپیہ چندہ دیا اس کالج کو قائم کیا جب
کالج فنڈ کمیٹی نے دیکھا کہ ان کی رائے و تدبیر کامیاب ہو گئی
ہی تو مثل ایک باز کے جو بلند ہوا سے شکار پر گرتا ہے دوڑ کر
اس کالج کو اپنے ہاتھ میں لے لیا پس نہایت انصاف سے
یہ بات کہنی چاہیئے کہ فونڈر اس کالج کے جس کی کامیابی سے
آج ہم اس قدر فخر کرتے ہیں صرف مولوی محمد سمیع اللہ خاں ہی
ہیں اور یہ عزت ہمیشہ اُنکے نام کے ساتھ رہے گی"

سرسید جب علیگڈھ سے باہر جاتے تو کالج فنڈ کمیٹی کا چارج بھی انہی کو
دے کر جاتے رؤسا سے ان کے تعلقات بہت وسیع تھے اور وہ کالج
کے لئے ہمیشہ ان سے نہایت خوبی کے ساتھ امدادیں حاصل کر لیتے تھے۔

مثال کے لیئے ہم اس موقع پر ان کی ایک تقریر کا اقتباس درج کرتے
ہیں جو انہوں نے اپنی خیر مقدم کی دعوت میں کی تھی اور جس میں بڑے
بڑے نامی رؤسا علیگڈہ جمع تھے انہوں نے کہا کہ ” آپ کا یہ خاص شہر
علیگڈہ جس کے نام سے ضلع علیگڈہ مشہور ہے کوئی بڑا شہر نہیں ہے
اس شہر میں کوئی قدرتی یا مصنوعی فضا یا قدیم آثار ایسے نہیں ہیں جو
اس شہر کو نامور کرتے لیکن اس وقت آپ کا یہ شہر ایسا نامور ہے
جیسا کہ اس ملک میں کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ شہر نامور ہو سکتا ہے کوئی
شہر کوئی قصبہ کوئی حصہ ملک کا ایسا نہیں ہے جہاں کے لوگ اب
اس شہر کے نام سے واقف نہوں جس چیز نے آج علیگڈہ کو ایسا نامی کر دیا
وہ کوئی اور چیز نہیں ہے بجز یہاں کے رؤسا کے فیض طبائع اور ان کے
شائستہ خیالات کے سینٹفک سوسائٹی جس کا یہ خوش نما اور وسیع
اور مرتفع ہال ہے جس میں ہم اور آپ جمع ہیں۔ یہ ایسی سوسائٹی ہے
کہ سب سے پہلے آزادی کا پہلا سبق شائستہ طور سے اس ملک میں اسی سوسائٹی
نے لوگوں کو پڑھایا تھا۔ یہ سوسائٹی ایسی مشہور ہو گئی جس کے بلڈنگ کا
نقشہ دنیا کے ایک ایسے نامور موقع پر ہے جہاں نہایت نامی گرامی
عمارتوں کے نقشے رکھے گئے ہیں یعنی لنڈن کے برٹش میوزم میں۔ یہ
کیا چیز ہے؟ اور کس نے قائم کیا ہے اوس کو؟ یہ اس ضلع کے رئیسوں

کی روشن دماغی کا نمونہ ہے اور جو کچھ ناموری ہوگئی ہے وہ اسی ضلع کے رئیسوں کی وجہ سے ہوئی ہے جن کی فیاض طبیعتیں جن کی ملکی اور قومی ہمدردیاں آج اس حصۂ ملک میں بے نظیر ہیں۔

سنٹیفک سوسائٹی جس کا میں نے ذکر کیا اوس بڑے کام کے سامنے اب کوئی چیز نہیں ہے جس سے توقع ہے کہ وہ اب ہماری مردہ قوم میں از سر نو جان ڈالے گا۔ یہ آپ کا مدرسۃ العلوم مسلمانان ہے میں اس بات کی بحث نہیں کرنا چاہتا اور نہ یہ موقع ہے کہ میں مدرسۃ العلوم کے فوائد بیان کرنے میں وقت کو صرف کروں اُس کے نتائج سے اکثر لوگ اور آپ خوب واقف ہو گئے ہیں اس وقت مدرسۃ العلوم کا ذکر کرنے سے مجھکو صرف اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ یہ پودا بھی آپ ہی کی عالی ہمتی اور فیاضی کے بھروسہ پر اس ضلع میں لگایا گیا ہے۔ اگرچہ اس مدرسہ کی امداد نہایت دور و دراز ملکوں کے مسلمانوں نے اور نامی اور مشہور رئیسوں اور نوابوں نے کی ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ایسے اعلیٰ درجہ تک مدرسہ نے ترقی کی ہے لیکن جب یہ سوال ہو کہ اس کی بنیاد کا پتھر کہاں کے رئیسوں کی عالی ہمتی کی بدولت رکھا گیا تو کوئی شخص اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس ضلع و بلند شہر کے دو رئیسوں کنور محمد لطف علی خاں صاحب اور راجہ سید باقر علی خاں صاحب کی

عالی ہمتی سے۔ اے صاحبو میں نے ایک واقعی لفظ کہا ہے کہ ضلع علیگڈھ و بلند شہر کے رئیسوں کے بھروسہ پر یہ مدرسہ یہاں قائم کیا گیا ہے جو اس ضلع میں زمین کے بہت بڑے حصے کے زمیندار ہیں اور اُن سے امید کی جاتی ہے کہ مدرستہ العلوم کی بھی وہی لوگ زمینداری کریں گے اور یہ ایک ایسا امر ہی جس کا پاس و لحاظ اس ضلع کے رئیسوں کو ہمیشہ رہنا چاہیئے۔

میرے دوست حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب اور حاجی محمد مصطفےٰ خاں صاحب نے مدرستہ العلوم کے متعلق میرا ذکر کیا ہے بلا شبہ مجھکو مدرستہ العلوم سے دلی تعلق ہے۔

مدرستہ العلوم کے تعلق سے ہمیشہ مجھکو خوشی و فخر رہا ہے لیکن میرے دوست مجھکو یہ کہنے سے معاف کریں گے کہ مدرستہ العلوم کے بانی کے لفظ سننے سے مجھکو نہایت شرم معلوم ہوتی ہے یہ نام میرے واسطے درحقیقت کسی طرح زیبا نہیں ہے ایسا خطاب اور جو عزتیں اس خطاب کے متعلق ہیں وہ سب آنریبل مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر کے واسطے ہیں میں نہ اُن کو قبول کروں گا مگر واقعات اصلی سے انکار بھی نہیں ہو سکتا کہ کھولنے والا اس مدرسہ کا میں ہی تھا لیکن سب جانتے ہیں کہ ایک چیز جو شروع کی جاوے اگر وہ قائم نہ رہے یا نہ رہ سکتی ہو تو اوس کے بانی کو بانی کہنا اوس کے لئے بجز شرم کے اور کوئی بات

نہیں ہوسکتی ہیں کہ مدرسہ کھولنے کے بعد اگر سید احمد خاں بہادر کی ذات نہوتی تو اُس کا قائم رہنا امکان سے خارج تھا اور جو نتائج اور جو ترقیاں آج آپ اس میں دیکھ رہے ہیں اُن میں سے کبھی کوئی ایک چیز بھی ہرگز نہ دکھلائی دیتی ؟؟

یہ ایک ناقابل تردید واقعہ ہے کہ یہ چند سال جن کو کالج کا ابتدائی زمانہ کہنا چاہیے اور جو نہایت ہی نازک زمانہ تھا انگریزی تعلیم سے عموماً مسلمانوں کو نفرت تھی سید صاحب کے مذہبی خیالات کی وجہ سے جو جمہور علماے اسلام کے خلاف تھے بارعب مسلمانوں کو قوت کے ساتھ حملہ کرنے کا موقع حاصل ہوگیا تھا بورڈنگ ہاؤس اور اُس کے بورڈروں پر نفرت انگیز الزامات کی بوچھاڑ تھی فریق مخالف ہر طرح پر مزاحمت کرتا تھا اوس وقت مولوی محمد سمیع اللہ خاں نے نہایت استقلال کے ساتھ عملی کارروائی سے اُن سب باتوں کا جواب دیا اور چونکہ اُن کے مذہبی خیالات اور پاک اعتقادات کی اس حصہ ملک میں شہرت تھی اُن کی ذات کے بھروسہ پر لوگ اپنی اولاد کو کالج میں بھیجتے تھے اور اکثر ان کو بورڈر بناتے تھے اونھوں نے تمام مخالفتوں کو اپنے زمانہ انتظام میں نیست و نابود کردیا تھا یہاں تک اُن کی کوشش و فہمائش و ترغیب کا اثر ہوگیا تھا کہ لوگوں نے اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے انگلستان بھیجنا پسند کیا انگلستان کی تعلیم سے نفرت کے

دور کرنے کے لئے مولوی محمد سمیع اللہ خاں نے ۱۸۸۰ء خود انگلستان کا سفر اختیار کیا اور اپنے ہمراہ علاوہ اپنے صاحبزادہ کے اپنے دوستوں کے لڑکوں حامد علیخاں اور محمد رفیق کو لے گئے جن کو ان کے والدین نے محض مولوی سمیع اللہ خاں کے اصرار و اثر سے لندن بھیجنا منظور کیا تھا۔

ان کی عموماً طالب علموں پر اور خصوصاً بورڈروں پر پدرانہ و مادرانہ شفقت تھی خوشی میں وہ اُن کے شریک ہوتے تھے بیماری میں اُن کی تیمارداری کرتے تھے جس زمانہ میں بورڈنگ میں زیادہ بیماری ہوتی تھی تو دس دس بجے رات تک بورڈنگ میں رہتے تھے اور اپنے آرام کی کچھ پروا نہ کرتے تھے ہر حالت میں اون کے تسکین دہ تھے وہ ہندوستانی تھے۔ ہندوستانی طبائع سے واقف تھے اور خوب جانتے تھے کہ جو اثر کہ نرمی و شفقت سے ہوتا ہے وہ سختی سے نہیں ہوتا ہے اونکی وہ شفقت پدری ایسی عمدہ ڈسپلن تھی کہ

۵۱۔ بیرسٹر امروہہ کے اثنا عشری لکھنو جن کے والد حکیم امجد علیخاں صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے اُن کا انتقال ہوگیا۔

۵۲۔ دہلی کے رئیس ڈپٹی الہی بخش کے صاحبزادے ہیں۔ بیرسٹر۔ سی۔ آئی۔ ای ریٹائرڈ جج ہائی کورٹ و ممبر انڈیا کونسل

کبھی کوئی اُن کے حکم سے متجاوز ہوتا تھا صرف یہی نہ تھا کہ محض نرمی ہی نرمی ہو بلکہ سختی و نرمی کا برتاؤ اپنے اپنے موقع پر تھا اُن کے اس طریقۂ عمل سے طالب علموں و بورڈروں کے اخلاق پر بے انتہا عمدہ اثر پڑتا وہ بورڈروں میں اخراج کے ذریعے سے ڈسپلن قائم کرنے والے نہیں تھے اُن کی یہ پالیسی نہیں تھی کہ ادنے ادنے قصور پر بورڈر بورڈنگ سے خارج کر دئے جاویں اونھوں نے کبھی کسی بورڈر کو اخراج کی سزا نہیں دی۔

سنہ ۸۴ء میں مولوی سمیع اللہ خاں لارڈ نارتھ بروک کے مشن میں مصر چلے گئے اور اوسی کے بعد سنہ ۸۵ء میں رائے بریلی میں ان کا تقرر ہوا۔ اس لئے اب کالج کے انتظام سے عملاً ان کا تعلق منقطع ہو گیا لیکن اخلاقی امدادوں میں کوئی کمی نہیں آئی اسی وجہ سے دروازۂ کالج سے سنٹرل ہال تک کوئی ایسا موقع نہ ہوگا جہاں ان کا نام نظر نہ آوے گا۔ ظہور حسین گیٹ سے کالج کا احاطہ شروع ہوتا ہے پہلے احاطہ کی جالی پران کا نام دکھائی دے گا پھر اس دلکش نظر فریب کتبہ پر نظر جائے گی جو عربی زبان میں ہے اور جس میں مسلمانوں کی ابتری و بربادی سید کی ہمدردی کالج کے قائم کرنے کے خیال اور کوشش اور قوم کے بزرگوں اور شریفوں کی مدد غیر قوم اور غیر مذہب

احباب کی اعانت کا مختصر تذکرہ ہے اور پھر مولوی سمیع اللہ خاں کی کوششوں کا
اس طرح ذکر کیا ہے :-

"لیکن اس کے معزز معاون اور قریبی رشتہ دار مولوی محمد سمیع اللہ
خاں بہادر سی۔ ایم۔ جی۔ کو خیال ہوا کہ فوراً مدرسہ
کھول دیا جائے اور خدا پر بھروسہ رکھا جائے پس
ان کو اس ارادہ میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی"

اس کے بعد کالج کلاسوں کے ایک کمرہ میں یہ کتبہ نظر آتا ہے۔

"ترقی خواہانِ قوم اگرچہ از چند سال درپے قیام ایں مدرسہ
کہ ذریعہ سود و بہبود قومی است و بجہت تعلیم و تربیت اطفال
نعمت غیر مترقبہ صرف ہمت می کردند مگر اجرائے آں بجز تاخیر
می افتاد۔ جناب مولوی سمیع اللہ خاں صاحب بہادر
رئیس دہلی جرأت و ہمت را بکار بردند و بتاریخ بست و چہارم
مئی ۱۸۷۵ء کہ روز سعید سالگرہ ملکہ معظمہ وکٹوریہ قیصر ہند بود
ایں مدرسہ را اجرا فرمودند۔ تمامی ممبرانِ کمیٹی مدرسۃ العلوم
ممنون و مشکور شاں بودہ اند و بہ اظہار شکرگذاری خود ہا
ایں لوح را نصب می نمایند و ایں منزل را بنام نامی
جناب ممدوح موسوم می سازند"

اُن کی مساعی جمیلہ کا ہر موقع پر اعتراف کیا گیا جس طرح سرسید، ممبران کمیٹی، رؤسا، و عمائد قوم اور قوم کے دلوں پر اُن کی کوششوں کا نقش مرتسم تھا اوسی طرح تمام حکام کو بھی اعتراف تھا۔

جب نومبر ۱۸۸۴ء میں لارڈ رپن نے کالج کا معائنہ کیا ہے اور ممبران کالج فنڈ کمیٹی کے ایڈریس کے جواب میں تقریر کی ہے تو اُس میں کہا کہ:۔

"اے صاحبو! مجھے معلوم ہوا ہے کہ مولوی محمد سمیع اللہ خاں نے اس انسٹی ٹیوشن کو بہت سے طریقوں میں مدد دی ہے (چیرز) اور مجھکو نہایت خوشی ہے کہ مجھکو اپنی طرف سے اُن کا شکریہ ادا کرنے کا یہ موقع حاصل ہوا ہے اور مجھکو کچھ شبہہ نہیں ہے کہ میں اُن تمام شخصوں کی طرف سے جو اس موقع پر اُن بیش بہا خدمتوں کا شکریہ ادا کر سکتا ہوں جو اونہوں نے اس کالج کی حق میں کی ہیں۔ (چیرز)

۱۸۸۶ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد قائم ہوئی اور اُس کا پہلا اجلاس علیگڈھ میں منعقد ہوا تو مولوی محمد سمیع اللہ خاں کو اس کا صدر منتخب کیا گیا اور اونہوں نے ایک باقاعدہ مجلس میں سب سے پہلے مسئلہ تعلیم مسلمانان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

(۳)

باوجودیکہ سرسید اور مولوی سمیع اللہ خاں کے عقائد اور خیالات مذہبی میں سخت تباین تھا لیکن قومی تعلیم اور مسلمانوں کی فلاح وبہبود کی تدابیر اور معاملات میں ان اختلافات کا کوئی اثر نہ تھا اور آپس کے تعلقات نہایت مستحکم اور شگفتہ تھے۔ ہر موقع پر ایک دوسرے کا قوت بازو ہمدرد اور بہی خواہ تھا اور بلاشبہ مولوی سمیع اللہ خاں کے مستقل ارادہ، طبیعت کی مضبوطی، اثر رسوخ اور وجاہت ذاتی سے کالج کو گرانقدر فوائد حاصل ہوتے تھے مگر کچھ عرصہ بعد کالج کے ڈسپلن کے متعلق دونوں میں اختلاف شروع ہوا جو معمولی شکل میں تھا مگر پھر مسٹر بیک کی وجہ سے اس نے افسوسناک شکل اختیار کر لی۔

مولوی سمیع اللہ خاں کی رائے تھی کہ یورپین اسٹاف کو ملازم کی حیثیت میں رکھنا چاہیے اور اُس کی ذمہ داری تعلیم تک محدود رہے اور تربیت کی نگرانی خود مسلمانوں کے ذمہ رہے کیونکہ یورپین مسلمانوں کی عقائد اور اُن کے محسوسات سے ناواقف ہوتے ہیں۔

سرسید کی رائے تھی کہ چونکہ مسلمانوں کے اخلاق خراب ہو چکے ہیں اور اُنھوں نے اپنی خوبیوں کو فراموش کر دیا ہے لہٰذا ضرورت ہے کہ مسلمان بچوں کی تربیت بھی یورپین اُستادوں اور نالیقوں

کی نگرانی میں ہو مسٹر بیک حاطہ کالج کے اندر اسٹاف کے علاوہ کسی
کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے تھے اور چونکہ سرسید پر مسٹر بیک کا اثر
روز بروز زیادہ اور قوی ہوتا جاتا تھا اور وہ مسٹر بیک کی رائے کا زیادہ احترام
کرتے تھے اس لئے رفتہ رفتہ مولوی سمیع اللہ خاں اور سرسید کے
دلوں میں وہ ہم خیالی اور یک جہتی باقی نہ رہی۔

ان ہی حالات میں سرسید نے کالج کا وہ قانون جس کا نام
"مجموعہ قواعد و قوانین ٹرسٹیاں ہے" پیش کیا جس کی وجہ سے وہ تمام
اتفاق و یک دلی اور احترام و ہمدردی جتنے کہ قریبی رشتہ داری کی الفت
و محبت سب کافور ہو گئی۔

مولوی سمیع اللہ خاں اس قانون میں بعض اہم نقائص تصور کرتے
تھے اور سب سے بڑا نقص جس کو اس عظیم فتنہ کا نچوڑ کہنا چاہئے ان کے
نزدیک اس قانون کی رو سے سرسید کے بعد سید محمود کو لائف آنریری
سکریٹری بنانا اور یورپین اسٹاف کا اقتدار بڑھانا تھا۔

ان نقائص پر بحثیں شروع ہوئیں اور رفتہ رفتہ ان بحثوں میں وہ
شان نمایاں ہو گئی جو حقیقتہً ایک ایسی جماعت کے لئے جو قومی اصلاح
کی مدعی بلکہ نمونہ تھی اور جس نے بلاشبہ بہت کچھ اصلاح بھی کی تھی
حد درجہ افسوسناک تھی۔ بالمقابل دو معارض و مبارز پارٹیاں

اہم ہوگئیں۔ ایک عرصہ تک میدانِ مباحثہ گرم رہا صدہا مضامین
پمفلٹ، خطوط، شائع ہوئے۔ پرائیویٹ طور پر اثرات ڈالے گئے
اور ایک سخت تصادم و تقابل کے بعد وہ قانون[1] منظور ہوگیا۔ اس منظوری
کے بعد کالج کے بہترین حامیوں اور ہمدردوں میں سے ایک حصہ کا تعلق
قطعیۃً منقطع ہوگیا اور مولوی سمیع اللہ خاں اس کام سے بالکل علیحدہ ہوگئے
جس کو ۲۵ سال تک انہوں نے کامل انہماک اولی العزمی اور جوش کے ساتھ انجام دیا تھا۔

۱۸۹۵ء میں نواب سر وقار الامراء مدارالمہام دولتِ آصفیہ جب
علیگڈھ تشریف لائے تو انہوں نے کوشش کی کہ سرسید اور مولوی
سمیع اللہ خاں میں صفائی ہوجائے اور انہوں نے ان دونوں کو ملادیا
سرسید نے ۱۸۹۶ء میں پھر ان کو ٹرسٹی بنانا چاہا لیکن چونکہ فتنۂ عظیم
مع شئے زائد ابھی موجود تھا مولوی سمیع اللہ خاں نے ایک اعتراضی خط کے
ساتھ ٹرسٹی شپ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور پھر عرصہ تک

---

[1] ۔ کالج کا ہی نہیں بلکہ قومی ارتقا کی تاریخ کا یہ اہم ترین واقعہ ہے
اور اس کے لئے کالج کی تاریخ کے ہی صفحات زیادہ موزوں ہیں۔
مولانا حالی مرحوم نے جب "حیاتِ جاوید" کے ایک ہزار صفحات میں
ان واقعات کو جگہ نہیں دی تو ہمارے اس مختصر تذکرہ میں کیونکر جگہ نکل سکتی ہے۔

اخبارات وغیرہ میں معرکہ آرائیاں رہیں۔

افسوس کہ ان نااتفاقیوں کی تہ میں بعض غیر متعلق اشخاص کی ہاتھوں نے بہت کام کیا اور بدبخت ہیزم کشوں نے اس نااتفاقی کی آگ کو بری طرح بھڑکا دیا۔

اِنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ

۱۸۹۸ء میں جب سرسید کا حادثۂ رحلت پیش آیا اور سرسید میموریل فنڈ قائم ہوا تو مولوی سمیع اللہ خاں کے دل پر قدیم تعلقات اور دیرینہ محبت کے اثرات تازہ ہو گئے اور انہوں نے نواب محسن الملک کے ساتھ شریک ہو کر اس فنڈ کے کامیاب بنانے کا ارادہ کیا لیکن بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خطرہ گذرا کہ مبادا مولوی سمیع اللہ خاں اپنی دیرینہ خدمات، ذاتی اثر و اقتدار اور سید محمود کی کیفیت مزاجی سے فائدہ اٹھا کر سکریٹری ہو جائیں جس سے انتظامات کالج میں انقلاب پیدا ہو جائے جو ہمارے اغراض و اقتدار پر ضرب کاری ہو اس لئے ان لوگوں کو یہ شرکت پسند نہ آئی۔

وہ ڈپوٹیشن میں شریک ہو کر رامپور گئے جہاں ہز ہائینس نواب صاحب بہادر دام اقبالہٗ نے پچاس ہزار روپیہ میموریل فنڈ میں عطا کئے جانے کا اعلان کیا۔ اور ہز ہائینس نے مولوی سمیع اللہ خاں سے پرائیوٹ طور پر بھی ملاقات کی

کچھ دن بعد ہز ہائینس نے اپنے عطیہ کو اس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا کہ انتظامات کالج میں ان کی مجوزہ اصلاحات قبول کی جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ ادھر چند سال سے کالج کی انتظامی حالت بہت خراب تھی ایک لاکھ سے زیادہ کے غبن[1] اور کالج کی ترقی پذیر حالت میں ذرائع آمدنی محدود اور کم ہو جانے سے شدید مالی مشکلات پیدا ہو گئی تھیں لیکن ہز ہائی نس کی شرط کو قبول کر لینے کا نتیجہ ان مشکلوں سے زیادہ مشکل تھا اس لئے ادب کے ساتھ انکار کر دیا گیا مگر بعض لوگ جو موقع کی متلاشی اور تاک میں تھے انہوں نے ہز ہائی نس کی شرط کو مولوی سمیع اللہ خاں کی پرائیوٹ ملاقات کا نتیجہ قرار دیا اور پمفلٹ بازی اور مضامین نگاری کا ایک تازہ ہنگامہ برپا ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی سمیع اللہ خاں نے جو قدم بڑھایا تھا وہ چند مہینہ بعد ہی پیچھے ہٹا لیا اور پھر بیک صاحب کی وفات سید محمود کی سبکدوشی اور نواب محسن الملک کی سکریٹری شپ کے باوجود انہوں نے احاطۂ کالج میں قدم نہ رکھا اور نہ اس قومی تحریک کے

---

[1] شام بہاری نے جو آنریری سکریٹری کے دفتر میں کلرک تھا وقتاً فوقتاً جعلی چیکوں سے روپیہ برآمد کیا تھا جس کی میزان ایک لاکھ سے متجاوز تھی ۱۸۹۵ء میں اتفاقیہ یہ راز کھل گیا، اس پر مقدمہ چلا، اور اس نے حوالات میں زہر کھا کر خودکشی کر لی۔

ساتھ اپنا نام وابستہ رکھنا پسند کیا۔

تاہم کالج کے معاملات سے ان کی دلچسپی قائم تھی اور چونکہ وہ علیگڈھ میں ہی سکونت رکھتے تھے اس لئے کالج کے طلبا سے برابر ملتے رہتے تھے اور کالج کے اندرونی حالات کے متعلق بھی گفتگوئیں رہتی تھیں اکثر کم استطاعت طلبا کی نہایت خفیہ طور پر مدد کرتے رہتے تھے انہوں نے اسی مقصد کے لئے ایک ذاتی فنڈ علیحدہ قائم کر رکھا تھا بعض اوقات اس میں اپنے خاص احباب سے بھی چندہ لیتے تھے لیکن کسی کو یہ علم نہ ہوتا تھا کہ کس طالب علم کو کس قدر امداد دی اور اس سچی نیکی کے سلسلہ کو انہوں نے زندگی بھر جاری رکھا۔

(۴)

۱۸۹۵ء کے واقعات نے جو ان کے کالج سے قطع تعلق کرنیکا باعث ہوئے اُن کو افسردہ دل کر دیا تھا لیکن قومی تعلیم کے ساتھ ان کی دلچسپی میں کمی نہیں ہوئی اور انہوں نے ایک اہم ضرورت کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔

الہ آباد یونیورسٹی سے اگرچہ متعدد کالجوں کا الحاق تھا جن میں محمڈن کالج بھی شامل تھا لیکن ان سب میں الہ آباد کا میور سنٹرل کالج تعلیمی سامان و انتظامات کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا تھا

اور اس کے سائنس اور قانون کے درجے تمام کالجوں سے ممتاز اور مکمل تھے۔ محمڈن کالج بورڈنگ سسٹم کے لحاظ سے الہ آباد یونیورسٹی کی دائرۂ اثر میں ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے کالجوں میں خاص امتیاز اور برتری رکھتا تھا مگر اس میں نہ تو لا کلاسیں تھیں اور نہ سائنس کا کوئی انتظام تھا اور مسلمانوں کو ان دونوں شعبوں میں ڈگریاں لینے کی ضرورت روز بروز زیادہ محسوس ہو رہی تھی اس لئے ایسے طالب علموں کو جو لا یا سائنس لینا چاہتے تھے یا علیگڈھ کے مصارف کا تحمل نہیں کر سکتے تھے اور وظائف لینے کو عار سمجھتے تھے یا اور دیگر اسباب سنٹرل میور کالج میں داخل ہونے پر مجبور کرتے تھے اُن کو لامحالہ الہ آباد جانا پڑتا تھا اور بورڈنگ ہاؤس نہ ہونے کی وجہ سے انکو تکالیف و مشکلات برداشت کرنی پڑتی تھیں اس لئے مولوی سمیع اللہ خاں نے الہ آباد میں ایک بورڈنگ ہاؤس بنانے پر اپنی توجہ اور کوشش مبذول کی۔ اپنے دوستوں اور دوسرے فیاض مسلمانوں سے چندہ لیا۔ گورنمنٹ نے بھی امداد دی اور اس طرح سنہ ۱۸۹۲ء میں محمڈن بورڈنگ ہاؤس کی بنیاد قائم کی گئی جس کا سنگ بنیاد سر اکلینڈ کالون لفٹنٹ گورنر نے رکھا جو اب میور کالج کی ایک شاندار عمارت ہے اور جس میں کافی طلبا کے قیام کا انتظام ہے۔

اس کی ایک خاص انتظامیہ مجلس ہے جو باورچی خانہ اور دیگر انتظامات

آسائش طلبار کی اخلاقی و مذہبی نگرانی کی ذمہ دار ہے۔ اس کے خاص قواعد وضوابط ہیں اور معزز مسلمان اس کا سپرنٹنڈنٹ ہوتا ہے۔
نماز کا باقاعدہ انتظام ہے اور ہمیشہ ایک مولوی بطور امام کے مامور رہتا ہے۔

لیکن کس قدر حیرت انگیز واقعہ ہے کہ جس وقت اس بورڈنگ ہاؤس کی بنیاد ڈالی گئی تو اس کو محمڈن کالج کی مخالفت پر محمول کیا گیا۔ اور علامہ شبلی نے اس کا تاریخی نام مسجد ضرار رکھا جس سے اس کی تاریخ سنہ ہجری بھی نکلتی ہے۔ (۱۳۰۸)

مولوی سمیع اللہ خاں کو تعلیم کے ساتھ جو گہری دلچسپی تھی اس کی بنا پر کلکتہ یونیورسٹی نے ان کو اپنا فیلو بھی مقرر کیا تھا۔

(۶)

مولوی سمیع اللہ خاں اگرچہ علوم قدیمہ کے عالم تھے، ان کی زندگی قدیم سوسائٹی کا نمونہ تھی، وہ ایک راسخ الخیال اور اعمال مذہب کے نہایت پابند تھے لیکن انھوں نے فراخ دلی، بے تعصبی اور اولوالعزمی کے ساتھ جدید تعلیمی و معاشرتی تحریکات میں حصہ لیا اور انھوں نے اپنے عمل سے اس بات کو ثابت کر دیا کہ اسلام معاشرتی اور تعلیمی ترقی کا مانع نہیں ہے بلکہ موید اور حامی ہے اور ایک مسلمان پورا پابند

مذہب رہ کر ان ترقیوں سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے ذاتی اثر اور اپنی ذاتی مثال سے خاموشی کے ساتھ ان تعصبات اور توہمات کو مٹایا جو انگریزی تعلیم اور یورپ کی تعلیم کے متعلق عام طور سے تھے ان کی سفر یورپ کا اہم مقصد یہی تھا کہ انگلستان کے تعلیمی انسٹی ٹیوشنوں کو دیکھیں اور تجربہ حاصل کریں تاکہ جو طریقے ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک اور ترقی کے لئے مفید معلوم ہوں اُن کو اختیار کیا جائے اور عام طور سے مسلمانوں میں جو جھجک اپنی اولاد کو یورپ میں تعلیم دلانے میں ہے وہ دور ہو جائے۔

جب وہ واپس آئے تو سر سید، نواب محسن الملک اور خواجہ محمد یوسف صاحب نے بمبئی میں اُنکا استقبال کیا اور دوستوں کے اصرار سے انہوں نے اپنے سفر کی روداد بھی قلمبند کی جو پہلے تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئی اور پھر مستقل کتاب کی صورت میں اردو انگریزی میں شائع ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں میں اس کے متعدد اڈیشن نکلے۔

وہ نڈر، بلند حوصلہ، ارادہ کے مضبوط تھے اور جب کسی رائے پر قائم ہو جاتے تھے تو اس میں کسی کی پروا یا کسی تعلق کا لحاظ نہ کرتے تھے۔ اُنہوں نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد ایسے وقت قائم کی جبکہ ایک طرف کمیٹی سرمایہ کی کمی کی وجہ سے متردد تھی۔ دوسری طرف حکام اُس خیالی خطرہ سے کہ علیگڈھ مسلمانوں میں خیالات بغاوت پیدا کرے گا

اُن تجاویز کو شک و شبہ سے دیکھتے تھے۔ نمبر ۲ مقابلہ اُن با اثر مذہبی پیشواؤں کا تھا جو اپنے تعصب اور تنگ خیالی کی وجہ سے انگریزی تعلیم کے رواج کو ناپسند کرتے تھے۔

اگر وہ اس وقت اپنی مضبوطی اور جسارت سے کام نہ لیتے اور پندرہ لاکھ روپیہ جمع ہونے کا انتظار کرتے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کس قدر اور پیچھے رہ جاتی اور کب تک حکام کو مسلمانوں کی تحریکات سے شک و شبہ قائم رہتا۔

اُنھوں نے پنشن لینے کے بعد اپنا زیادہ وقت عبادات اور اشغال مذہبی میں بسر کیا اور ۱۹۰۸ء میں حج بیت اللہ اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت سے بھی شرفیاب ہوئے اور "دلائل الخیرات" کا ایک نہایت عمدہ نسخہ شائع کرایا جو عرب، ہندوستان اور دیگر اسلامی ممالک میں بہت پسند کیا گیا۔

وہ علوم قدیمہ کے نہایت ممتاز عالم تھے دورانِ ملازمت میں بھی ان علوم سے اُن کی دلچسپی بدستور قائم رہی۔ وہ کسی نہ کسی نوجوان طالب علم کو جس علم کی صلاحیت اُس میں موجود ہوتی ہمیشہ درس دیتے رہتے تھے منطق اور اخلاق کی تعلیم سے کئی آدمی مستفید ہوئے اور متعدد وکلا اور حکام نے اُن سے کبھی کبھی قانون بھی پڑھا۔ ان کی نیکیاں

اور فیاضیوں کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا لیکن اصول یہی رہا کہ دائیں ہاتھ سے جو کچھ دیا بائیں ہاتھ کو اُس کی خبر نہ ہوئی۔

اُن میں نصیحت کرنے اور اپنی بات منوا لینے کی ایک خاص قدرت تھی اور اُن کے مخاطب اُن کے سامنے جُھک جاتے تھے۔

اُن کے دوستوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی اور اُن کے ساتھ مل کر اور اُن کو اپنا مہمان بنا کر اُنھیں بہت خوشی ہوتی تھی۔ وہ نہ تو سرکاری عہدہ دار رہے تھے اور نہ اُن کے پاس کوئی ایسا اعزازی عہدہ تھا جس میں پبلک کے ساتھ تعلقات وسیع ہوتے ہیں اور نہ وہ قومی تحریکات میں پیش پیش تھے تاہم ہمیشہ اُن کے ملنے والے اور دیگر اشخاص احترام و محبت کے جذبات لئے ہوئے اُن کے پاس آتے تھے۔

اُن کی ذات پر عوام و خواص کو بڑا اعتماد تھا اور اسی وجہ سے اکثر فریقین اِن کو اپنا ثالث اور حکم مقرر کرتے تھے اور اُن کی بے لاگ اور ایمان دارانہ فیصلوں کو منظور کر کے عدالتی کشمکش اور سرگردانی سے محفوظ رہتے تھے۔

قدرت نے ان خوبیوں اور قابلیتوں کے ساتھ وجاہت اور حسن صورت کی نعمت بھی مرحمت کی تھی۔

انہوں نے بہت عرصہ پیشتر علیگڈھ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور آخر وقت تک وہیں قیام رکھا۔ ۱۹۱۰ء میں چند روزہ علالت کے بعد ۷۔ اپریل کو بعد ظہر ۸۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥ اُن کی وصیت کے مطابق اُن کا جنازہ دہلی لے جایا گیا۔ دونوں جگہ نماز جنازہ ہوئی جس میں بے انتہا مجمع تھا۔ دہلی میں جب جنازہ پہنچا تو حالانکہ رات کا وقت تھا لیکن اسٹیشن سے دلّی دروازہ تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے وہ اسی وقت اپنے آبائی قبرستان میں دفن کئے گئے۔ جو شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہما کے مزارات کے قریب ہی واقع ہے۔

اُن کی وفات پر ہز اکسیلنسی وائسرائے، ہز آنر لفٹنٹ گورنر اور اعلیحضرت نظام، اور کثیر التعداد یورپین اور ہندوستانی احباب نے تعزیتی تار بھیجے۔ اگرچہ اُن کا کوئی تعلق کالج سے باقی نہیں رہا تھا لیکن اس حادثہ کے وقت اُن کی عظیم الشان خدمات فراموش نہیں کی گئیں۔ اور اُن کے ماتم میں ایک دن کے لئے کالج بند کیا گیا۔ اور اُن کے ورثا اور احباب نے صدر دروازہ کی بالائی منزل کا ایک حصہ اُن کی یادگار میں تعمیر کرایا جس میں اب یونیورسٹی کا دفتر ہے اور جو سمیع منزل کے نام سے موسوم ہے +

سید عبدالکریم۔ بی۔ اے

ایل۔ ایل۔ بی)۔ (علیگ) اسپیچ ہال۔